ترجمۃ القرآن

شاہ ولی اللہ کی ایک اہم علمی خدمت

سیدہ حنا ایم اے

اسلام میں دوسرے مذاہب کی نسبت اجتماعی عمل کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر و تؤمنون باللہ۔

اور اسی حکمت کے پیش نظر نبی کریمؐ نے بہ نفس نفیس اپنی نگرانی میں صحابہ کرام کی ایک معتدبہ جماعت ایسی تیار کی تھی جو وفود کی صورت میں مختلف قبیلوں اور علاقوں میں دورہ کرکے لوگوں کو امور دین سمجھاتی اور سکھلاتی تھی۔ یہ اس تربیت کا فیض تھا کہ حضورؐ کے بعد مدینہ دارالعلم بنا۔ کوفے اور بصرے کی خاک سے فقہا اور محدثین کی ایک کثیر تعداد اٹھی اور بلاد اسلامیہ میں پھیل گئی۔ مدرسہ اہل حجاز یا مدرسہ اہل مدینہ سے امت مسلمہ کو امام مالک جیسا امام اور مؤطا جیسی احادیث نبوی کی کتاب ملی۔ امام شافعی فرمایا کرتے تھے۔

"تابعین کے بعد امام مالک بندوں کے لئے اللہ کی سب سے بڑی حجت ہیں جب کوئی حدیث مالک کی روایت سے تم کو پہنچے تو اسکو مضبوطی سے پکڑ کیونکہ وہ علم حدیث کا ایک درخشاں ستارہ ہیں۔"

مؤطا امام مالک کا ایسا کارنامہ ہے جس سے رہتی دنیا تک امت مسلمہ رہنمائی حاصل کرتی رہے گی۔ ادھر کوفے کے مکتب فکر نے امام ابوحنیفہ جیسا بلند پایہ عالم پیدا کیا جس کے مرتب کئے

ہوئے اصول فقہ تا قیامت مسلمانان عالم کے لئے فکر و نظر کے اسباب مہیا کرتے رہیں گے۔
آپ نے امت مسلمہ کو اجتہاد جیسی نعمت عطا کی۔ فرماتے تھے۔ ابراہیم شعبی۔ ابن سیرین عطاء اور سعید بن جبیر نے بھی اپنے زمانے میں اجتہاد کیا۔
پس میں بھی اجتہاد کرتا ہوں [۲]
اس طرح آپ نے قوم کو تقلید جامد سے بچا کر اس پر غور و فکر اور ترقی و تکمیل کی نئی نئی راہیں کھول دیں۔

کسی تحریک کو کامیاب بنانے اور اسے دور تک چلانے کے لئے شخص سے زیادہ جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مصلحت کے پیش نظر ایسا بندوبست کیا گیا کہ ہر دور اور ہر زمانے میں مسلمان علماء کی ایک جماعت احکام شریعت کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف رہے۔ حضور نبی کریم کے زمانے میں بانع نظر اصحاب کی تعداد اتنی تسلی بخش تھی کہ ختم نبوت کا اعلان کر دیا گیا۔ اور علماء کو انبیاء کرام کا وارث قرار دیا گیا۔ جیسا حضور کا ارشاد ہے۔

ان العلماء ورثۃ الانبیاء

یعنی اس وقت ایک ایسی جماعت تیار ہو چکی تھی۔ اور جماعت سازی کا کام ایسے خطوط پر ہونے لگا تھا کہ اس کے ذریعہ منصب نبوت کی تکمیل بہ آسانی ہو سکتی تھی۔ حضور نبی کریم کے بعد جو چار مکاتیب فکر قائم ہوئے وہ بھی انہیں خطوط پر کام کر رہے تھے جن پر حضور کے زمانے میں کام ہو چکا تھا۔ ان چاروں سربرآوردہ ائمہ نے اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کی ایسی معتدبہ جماعتیں تیار کر دی تھیں جو ان کے خیالات و افکار کو انہیں خطوط پر آگے بڑھا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مقلدین آج بھی دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں ان میں امام ابو حنیفہ کو نہ صرف ان کے فقہی افکارات اور وسیع النظری کی وجہ سے بلکہ ان کے عظیم اور باعمل تلامذہ کے باعث بھی خصوصیت حاصل ہے اور ہمیشہ رہے گی

---

[۱] فلسفہ شریعت اسلام صہ ۴۹ تا ۵۱
[۲] فلسفہ شریعت اسلام صہ ۳۷۔ ۳۸

اس برصغیر میں یہ شرف امام الہند شاہ ولی اللہ کو حاصل ہے کہ تلامذہ اور عقیدتمندوں کے علاوہ خود آپ کے خانوادے میں محض آپ کے فیض تربیت اور توجہ سے عرصہ دراز تک ایسے عالم پیدا ہوتے رہے جنہوں نے آپ کی تحریک کو ملک گیر بنانے میں بڑا نمایاں کام انجام دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ شاگرد سیرت و کردار کا صرف ایک رخ دیکھتے ہیں اور استاد کی صرف علمی استعداد سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ لیکن گھر کے لوگوں کے سامنے پوری شخصیت ہوتی ہے۔ ان کے سامنے علمی استعداد کے علاوہ عملی زندگی بھی ہوتی ہے اور وہ اس جذبے کی گہرائی اور گیرائی سے شاگردوں کی نسبت زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے ذریعہ جو تشریح و تفسیر سامنے آتی ہے وہ اصلیت سے زیادہ نزدیک ہوتی ہے اور اس میں وہ جذبہ زیادہ نمایاں ہوتا ہے جو کسی تحریک کے بانی کے سینہ میں موجزن ہوتا ہے اس لئے جب گھر کے افراد اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو وہ زیادہ موثر زیادہ مقبول اور زیادہ ہمہ گیر ہو کر پھیلتی ہے۔ اور یہ شاہ صاحب کی انتہائی خوش بختی تھی کہ ان کی تحریک ان کے بعد انہیں کے بیٹے پوتوں کے ہاتھوں بڑھی پھلی پھولی اور پروان چڑھی ورنہ عوام الناس میں تو ولی کے گھر بھوت کی مثل مشہور ہے۔ لیکن شاہ صاحبؒ کی طرح ان کا خانوادہ بھی اس نمایاں خصوصیت کا حامل ہے کہ وہاں ولی کے گھر ولی ہی پیدا ہوئے۔

شاہ صاحب کا زمانہ فتنہ و شر جہالت و گمراہی کا زمانہ تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ علم دین ایک خاص طبقے میں محدود ہو کر رہ گیا تھا اور اپنی طرف سے جو لوگ عوام کے رہنما بن بیٹھے تھے وہ عموماً نیم خواندہ مولوی اور ملا تھے۔ اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی کی شہادت ملاحظہ فرمائیے ہیں۔

> مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام تھا۔ مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا زور تھا۔ جھوٹے فقیر اور مشائخ اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے اور اپنے بزرگوں کے مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق اور حکمت کے ہنگاموں سے پرشور

> فقہ اور فتاویٰ کی لفظی پرستش پر فقہی کے پیش نظر تھی۔ مسائل فقہ میں تحقیق و تدقیق مذہب کا سب سے بڑا جرم تھا۔ عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی و مطالب احادیث کے احکام و ارشادات اور فقہ کے اسرار و مصالح سے بے خبر تھے۔ [۱]

اور مولانا مسعود عالم ندوی رقمطراز ہیں۔

> خواص یعنی اہل درس و مسند کا حال اور برا تھا۔ صاف صاف کہتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے پر موقع ایسا آ پڑا ہے کہ بے کہے بھی رہا نہیں جاتا۔ نام نہاد صوفیا اور نقرا فقر کی بساط بچھا کر سادہ لوح مسلمانوں کے مال اور ایمان پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں مدرسوں میں ابھی تک ارسطو کی سڑی ہوئی لاش پر عمل جراحی جاری ہے شمس بازغہ اور قاضی مبارک کی دھوم ہے۔ قرآن کریم اور حدیث کی کانوں میں بھنک پڑ جائے تو خیر حرج نہیں لیکن ان کی تحصیل میں عمر عزیز کے کچھ حصے ضائع کئے جائیں یہ ناممکن ہے۔ [۲]

اور جو لوگ قرآن و حدیث کی تحصیل میں عمر عزیز کے کچھ حصے صرف بھی کرتے تھے ان کا حال بھی ان سے کچھ مختلف نہ تھا۔ مولانا عبیداللہ سندھی فرماتے ہیں۔

> پہلے علماء کا یہ دستور تھا کہ قرآن شریف حفظ تلاوت کرنے کے لئے پڑھاتے تھے اور مطالب سکھانے کے لئے جس فن سے انہیں دلچسپی ہوتی تھی اس قسم کی ایک تفسیر طالب علم کو پڑھا دیتے جس سے قرآن شریف گویا اس فن کی ایک اعلیٰ کتاب بن جاتی تھی۔ اور جو اخلاقی ذہنیت استاد کی طبیعت میں مرکوز ہوتی۔ تفسیر پڑھنے سے اور راسخ ہو جاتی۔ [۳]

---

[۱] معارف نمبر ۵ جلد ۲۲۔ [۲] الفرقان بریلی ولی اللہ نمبر ص ۳۹

[۳] الفرقان بریلی ص ۲۸

فتح الرحمٰن کی تفسیر میں خود شاہ صاحب نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے فرماتے ہیں

> اب تک قرآن مجید کے مطالب سمجھنا صرف عربی تفاسیر پر منحصر تھا جسے علماء اپنا ہی حصہ سمجھ بیٹھے تھے اور عوام کلام الٰہی کا منشا اور فطرۃ اللہ کا مفہوم سمجھنے سے محروم اور بے نصیب تھے طوطے کی طرح قرآن مجید پڑھتے تھے۔[1]

ان حالات میں ضرورت اس بات کی تھی کہ قرآن کریم کا ترجمہ ملکی زبان میں عام فہم اندازسے کیا جاتا کیونکہ دین اسلام کا سب سے بڑا اور پہلا ماخذ قرآن کریم ہی ہے چنانچہ ہر مسلمان تک خدا کا پیغام براہِ راست اور بالتصریح پہنچانا بے حد ضروری تھا تاکہ بندوں کا رشتہ براہِ راست خدا سے استوار ہوسکے ان حقائق کے پیش نظر اللہ کے بعض مخلص بندوں نے قرآن کریم کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی۔ زمانۂ حال کی تحقیقات سے ایسے کئی تراجم کا پتہ چلا ہے جن میں مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید شریف جرجانی اور مخدوم نوح ہالائی کے تراجم قابل ذکر ہیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ یہ تراجم مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر رواج نہ پاسکے اور عوام تک نہ پہنچ سکے۔

۱۔ پہلی اور قابل ذکر وجہ طباعت اور اشاعت کی مجبوری
۲۔ عام جہالت اور ناخواندگی
۳۔ کٹر ملاؤں کی مخالفت
۴۔ عوام میں اندھادھند تقلید کرنے کا جذبہ

ان کے علاوہ ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ایسی تمام کوششیں انفرادی اور غیر منظم تھیں انہیں ایسے لوگ میسر نہ آسکے جو اس کام کو آگے بڑھاتے۔ وقت کے تیور پہچانتے اور بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیتے۔ وقت کا اہم تقاضا تھا کہ کوئی ایسا مرد مجاہد پیدا ہو جو ملک و ملت میں حالات کے مطابق معقول اصلاح کرکے ان کی خرابیاں دور کرے چنانچہ مشیت

۱؎ تفسیر فتح الرحمٰن

باری میں شاہ صاحب کو اس کام کے لئے چنا گیا۔ امام حسن حسینؓ نے اپنے نانا کا قلم سپرد کیا اور خود حضور کی روح مبارک نے نمودار ہو کر چادر اڑھائی۔ اور زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اٹھی۔ اور تو خود باری تعالیٰ کی جانب سے انکو فاتحیت کا خلعت عطا ہوا اور آپ سے ایسے امور ظہور میں آئے جن کے نتائج دور رس اور دیر پا ثابت ہوئے۔

آپ کی مشہور تصنیف حجتہ اللہ البالغہ کو اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو دین اسلام کی کامل تصویر اور قرآن کریم کی مکمل تفسیر ہے لیکن کیونکہ یہ عربی میں تھی اور عوام کی دسترس سے بالا۔ اس لئے آپ نے اس زمانہ کی مروجہ فارسی زبان میں قرآن کریم کا مختصر جامع اور عام فہم ترجمہ کیا۔ جس سے عام لوگوں کو کلام الٰہی کا سمجھنا آسان ہو گیا۔[1]

اس ترجمہ کا اس زمانے کے خواندہ طبقہ کی جانب سے خاطر خواہ خیر مقدم کیا گیا اگرچہ اس زمانے کے قدامت پسند علماء آپکی اس جسارت پر برہم بھی ہوئے چنانچہ پروفیسر فری لینڈ ایبوٹ۔ اپنی تصنیف سلطنت مغلیہ کا زوال اور شاہ ولی اللہ میں لکھتے ہیں۔

> شاہ ولی اللہ نے قرآن مجید کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا ہندوستان میں اس وقت بہت کم مسلمان عربی جانتے تھے لیکن فارسی ان کے اونچے طبقے کی زبان تھی۔ ان کے اس اقدام سے بہت سے قدامت پسند علماء ناراض ہوئے۔ وہ کلام اللہ میں کسی قسم کی تبدیلی کے خواہ وہ ترجمہ ہی کیوں نہ ہو عقیدۃً خلاف تھے۔"[2]

حیات ولی کے حاشیہ میں شاہ صاحب کے سفر عرب کے سلسلہ میں یہ واقعہ بالتفصیل درج ہے کہ جب شاہ صاحبؒ نے فارسی میں قرآن حکیم کا ترجمہ کیا اور اسکی اشاعت ہوئی تو کٹ ملاؤں میں ایک عظیم تہلکہ برپا ہو گیا اور ایک مرتبہ بعد نماز عصر انہوں نے شہر کے غنڈوں کو لے کر حملہ کر دیا۔ وہ شاہ صاحب کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ جب شاہ صاحب

---

[1] حیات ولی ص ۴۸۹

[2] الرحیم مئی ۱۹۶۴ء ص ۶۹

نے ان سے اپنا جرم معلوم کیا تو انہوں نے کہا کہ تو نے قرآن کا ترجمہ کر کے بالکل عوام الناس کی نظروں میں ہماری وقعت کو کھو دیا ہے دن بدن ہماری روزی میں خلل پڑتا جاتا ہے اور ہمارے معتقد کم ہوتے جاتے ہیں اور یہ ہمارے ہی لئے نہیں بلکہ ہماری آیندہ نسلوں کے لئے بھی سخت نقصان دہ ہے۔ اس پر شاہ صاحب نے جواب دیا۔ تم خدا کی نعمت خاص کرنی چاہتے تھے میں نے عام کردی"۔ بہرحال شاہ صاحب کو خدا نے ان کے شر سے محفوظ رکھا۔ لیکن شاہ صاحب نے اس سلسلے میں سفر عرب اختیار کیا۔"[1]

ہمارے خیال میں یہ روایت بچند وجوہ محل نظر ہے۔

اول تو یہ کہ شاہ صاحب کو مخالفت میں اتنا تشدد نہیں برتا جا سکتا کیونکہ شاہ صاحب ایک مشہور اور معزز خاندان کے صاحب حیثیت اور صاحب اثر فرد تھے آپ پر اس طرح کھلے بندوں ہاتھ ڈالنا آسان بات نہ تھی دوسرے یہ کہ بڑے سا بڑا کٹ ملا بھی واشگاف الفاظ میں یہ اعتراف نہیں کر سکتا کہ اس طرح اس کی روزی میں خلل پڑے گا یا اسکی وقعت کم ہو جائے گی۔ جو لوگ انسانی نفسیات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اپنی کمزوری کے اعتراف کے لئے بڑی اخلاقی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے ایسی جرأت وہ لوگ کبھی نہیں کر سکتے جو اخلاقی لحاظ سے دیوالیہ ہو چکے ہوں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ انہوں نے مخالفت کے لئے عربی زبان کے تقدس کو آڑ بنایا ہو۔ بدعت کفر اور الحاد کے فتوے لگائے ہوں۔ اور اس قسم کے دلائل دیئے ہوں جیسے اہل مصر نے اس وقت دیئے تھے جب وزارت مصریہ نے اعلان کیا تھا کہ قرآن کریم کا ترجمہ سرکاری طور پر مختلف زبانوں میں کیا جائے۔ تاکہ تعلیمات اسلامیہ کی اشاعت ہو سکے اس وقت مخالف پارٹیوں کی جانب سے اس تجویز کی مخالفت میں مندرجہ ذیل دلائل دیئے گئے۔

۱۔ عربی اسلام اور اہل اسلام کا شعار ہے قرآن کریم الفاظ اور معانی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے پس ترجمہ کر دینے کی صورت میں یہ تعریف باقی نہیں رہتی۔

---

[1] حیات ولی حاشیہ ص ۴۱۸ - ۴۱۹

۲۔ ترجمہ کرنے سے زبان اور وطن پر مضرت رساں اثرات پڑتے ہیں

۳۔ قرآن کریم میں جو روحانیت اور نور ہے اس کا ترجمہ ممکن ہی نہیں بلکہ ترجمہ اسے زائل کر دیتا ہے" ؎۲

عجب یہ ہے کہ ایسے ہی دلائل اس وقت ہندوستان کی مخالف پارٹیوں نے بھی دیئے ہوں گے اس کے علاوہ تیسری قابل غور بات یہ ہے کہ راوی نے اسی مخالفت اور شورش کو شاہ صاحب کے سفر حجاز کا سبب قرار دیا ہے جب کہ .... شاہ صاحب نے سفر حجاز ۱۱۴۳ھ کے آخر میں اختیار فرمایا۔ اور ۱۱۴۵ھ میں واپس تشریف لائے۔ اور فتح الرحمٰن کی بیاض ۱۱۵۱ھ میں ختم ہوئی اور ۱۱۵۶ھ میں اسکی اشاعت ہوئی۔ یعنی یہ واقعہ سفر حجاز سے تقریباً پانچ چھ سال بعد کا ہے نہ کہ پہلے کا ؎۳

بہر حال مخالفت ہوئی ضرور جیسا کہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی فرماتے ہیں آپنے (شاہ صاحب نے) قرآن مجید کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تاکہ اس کا افادہ عام ہو سکے آپ کا یہ اقدام غیر معمولی عمل تجدید تھا۔ جس نے عام علماء میں ان کی خود غرضی کی بنا پر بے چینی پیدا کر دی تھی ؎۴

اس سلسلے میں ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ فتح الرحمٰن لکھنے کے جرم میں نجف خاں نے شاہ صاحبؒ کے پہنچے اتروا دیئے تھے۔ لیکن اب یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ یہ محض افواہ ہے اور درحقیقت ایسا نہ ہوا تھا اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ خود شاہ صاحب یا آپ کے عظیم المرتبت صاحبزادوں کی تحریروں سے اس افواہ کی صداقت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ دوسرے یہ کہ شاہ صاحب کی مکمل زندگی تاریخ کی روشنی میں

؎۲ فلسفہ شریعت اسلام ص ۱۶۱ - ۱۶۲

؎۳ شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص ۲۰۴ - ۲۰۲

؎۴ الفرقان، ولی اللہ نمبر ص ۳۲۹

ہے اور اس کا ہر پہلو نہایت واضح ہے ان کے سوانح نگار ان کو زندگی کے آخری لمحات تک نہایت مقبول۔ معزز اور فعال حیثیت میں دیکھتے اور پیش کرتے ہیں۔ اگر درحقیقت ایسا ہوا ہوتا تو تاریخ کی پیشانی پر ایک شکن تو ضرور پڑ جاتی۔ اس واقعہ کے خلاف شہری شہادت تاریخ کی ہے یعنی نجف خاں پہلی مرتبہ بادشاہ شاہ عالم کے ساتھ ۱۷۷۲ء میں دہلی آتا ہے اور دہلی میں اس کا اقتدار اس تاریخ کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اور اس تاریخ سے پورے دس سال قبل یعنی ۱۷۶۲ء میں شاہ صاحب کا انتقال ہو جاتا ہے[1]

ان حقائق کی روشنی میں ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ محض افواہ ہے جس میں صداقت کو کوئی دخل نہیں ہے۔

تاہم یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس زمانے میں معاشرے کی زوال پذیری اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ ظاہری نمود و نمائش اور غیر اسلامی رسوم و رواج کا دور دورہ تھا۔ وصایائے اربعہ کے مقدمہ میں مقالات الشعراء کے حوالے سے لکھا ہے کہ

مذہبی بدحالی حد بیان سے باہر ہے توہم پرستی۔ مراسم پرستی اور عملی زندگی کے مزار اس دور کی نمایاں علامات تھیں جاہل صوفی اور خوش عقیدہ مولوی عوام کے مقتدا بنے بیٹھے تھے۔ اندھی تقلید نے معاشرے کا جنازہ نکال دیا تھا جاہل پیر اور صوفی لوٹ مچائے ہوئے تھے[2]

اس سلسلے میں شاہ صاحب کو ایک فضیلت یہ بھی حاصل ہے کہ انہوں نے اپنی علمی اور دینی صلاحیتیں بجائے شاہی درباروں اور حلقۂ مریدان باصفا کے لئے وقف کرنے کے عوام کے لئے وقف کیں۔ جدید دنیا نے آج صدیوں بعد عوام کی اہمیت کو سمجھا ہے جب کہ شاہ صاحب کی بالغ نظری نے بہت پہلے اس اہمیت کا احساس اور اس حقیقت کا ادراک کر لیا تھا۔

---

[1] مجموعہ اربعہ وصایا ص ۱۸ [2] شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص ۲۱ - ص ۲۰۲

چنانچہ حرمین شریفین میں ۱۴ ماہ قیام کے بعد واپس ہونے پر آپ نے مسلمانوں کی گذری بیتی عظمت کے احیار کا کام شروع کیا اور اس سلسلہ کی پہلی کڑی آپ کا قرآن کریم کا فارسی ترجمہ اور اس کی شرح تھی اور اس عصر میں کیونکہ عوامی زبان فارسی تھی۔ اور آپ کا تعلق براہ راست عوام سے تھا اس لئے قرآن فارسی کا ترجمہ نہ صرف با محل بلکہ ناگزیر تھا یہی نہیں بلکہ آپ کے بعد آپکے صاحبزادوں نے اس تعلق کو زیادہ استوار کیا۔ شاہ عبدالعزیز کے دور میں فارسی کی جگہ اردو نے لے لی تھی اس لئے آپ کے بھائی شاہ عبدالقادر نے قرآن مجید کا ترجمہ اردو میں کیا نیز آپ کے بھتیجے شاہ اسمٰعیل شہید نے کئی دینی کتب اردو میں تصنیف کیں کیونکہ یہ تحریک فی اصلہ ایک عوامی تحریک تھی۔ اور یقیناً پیغام بھی عوام سے متعلق تھا۔ چنانچہ اس کی ابتدائی تیاریاں اسی انداز پر کی گئیں

ایک دوسرے موقعہ پر پروفیسر جلبانی فیوض الحرمین اور تفہیمات کے حوالے سے فرماتے ہیں۔ شاہ صاحب سفر حرمین سے دہلی واپس آئے تو لوگوں کو قرآن پاک کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دی۔ اور پرانے بوسیدہ نظام کو توڑنے کا نعرہ بلند کیا۔ [1]

اور وہ پرانا نظام کیا تھا۔ اندھی تقلید۔ خوش عقیدہ مولویوں اور نام نہاد صوفیاء کی لوٹ کھسوٹ جس کا نشانہ نیم خواندگی اور عربی سے ناواقفیت کے باعث براہ راست عوام تھے شاہ صاحب جادۂ حق کی طرف صحیح معنوں میں انکی رہنمائی کی قرآن کریم کا سادہ اور عام فہم ترجمہ اس وقت عوام کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور یہ بالکل فطری اثر تھا۔ ہر جگہ ہر زمانے اور ہر مذہب و ملت کے لوگ اپنی الہامی کتب کا مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں اس موضوع پر علامہ اقبال نے اپنے چھٹے خطبہ میں ترکی کے ایک عوامی شاعر

---

[1] شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص ۴

ضیاء کی نظم کا حوالہ دیکر بڑے اچھے پیرائے میں بحث کی ہے۔ ضیا کہتا ہے۔

> وہ سرزمین جہاں ترکی میں اذان دی جاتی ہے جہاں نمازی اپنے مذہب کو جانتے اور سمجھتے ہیں جہاں قرآن کی تلاوت ترکی زبان میں کی جاتی ہے جہاں ہر چھوٹا بڑا احکام الٰہیہ سے واقف ہے۔ اے فرزند ترکی وہ ہے تیرا آبائی وطن۔

شاعر کے اس تخیل پر بحث کرتے ہوئے علامہ اقبال کہتے ہیں اگر مذہب کا مقصد فی الواقعہ یہ ہے کہ انسان کا دل روحانیت سے بھر دے تو ضروری ہے کہ وہ یعنی مذہب اس کے رگ و پے میں سرایت کر جائے۔ لیکن شاعر کہتا ہے کہ جب تک اس کے یعنی مذہب کے روحانیت خیز افکار مادری زبان میں ادا نہیں کئے جاتے ایسا ہونا ناممکن ہے علامہ اسے شاعر کا ایک قابل اعتراض اجتہاد قرار دیتے ہیں۔ مگر فوراً ہی موحدین کے دور حکومت سے اسکی تائید میں ایک مثال پیش کر دیتے ہیں۔ جب محمد مہدی ابن تومرت نے حکم دیا تھا کہ چونکہ بربر ایک ناخواندہ قوم ہیں لہٰذا ان کی خاطر قرآن مجید کا ترجمہ اور تلاوت بربری زبان میں دی جائے حتیٰ کہ علماء اور فقہا بھی اس کی تعمیل کریں۔[۲]

بہرحال یہ ایک علیحدہ بحث ہے اور ظاہر ہے سخت مضرت رساں بھی کیونکہ اگر عربی کو فارسی ترکی اور دوسری زبانوں سے بدلنے کا عمل شروع ہو جاتا تو کلام الٰہی کا محفوظ رہنا شک و شبہ میں پڑ جاتا ہاں ترجمہ کی حد تک یہ اجتہاد ہرگز اعتراض نہیں کیونکہ مذہب کو اور مذہبی احکامات کو جاننے اور سمجھنے کی آرزو انسانی فطرت ہے اور پھر اسلام تو دین فطرت ہے اس مذہب میں جس قدر اہتمام و تفہیم پر زور دیا گیا ہے غالباً کسی اور مذہب میں نہیں دیا گیا۔ علم۔ اور شعور کے الفاظ اور ان کے مختلف صیغے کلام پاک میں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ اور ظاہر آیات قرآنی کے مخاطب

لہ شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص ۲۲

۲ تشکیل جدید الٰہیات ص ۲۴۸ - ۲۴۹

عام لوگ تھے جب قرآن کریم ان کا یہ حق تسلیم کرتاہے کہ حق طرح طرح کے دلائل و براہین سے ان کے ذہن نشین کرے تو دوسرے ممالک میں بسنے والے پیروان اسلام کو بھی یہ حق پہنچتاہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کا پیغام براہِ راست اور پوری طرح سمجھیں اور سمجھ کر اسکے احکامات پر عمل کریں۔ عوام کے اس حق کی تائید خود قرآن پاک اور احادیث نبوی سے بھی ہوتی ہے۔ سورہ فرقان میں ارشاد ہوتاہے۔

تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہٖ لیکون للعالمین نذیراہ

(ترجمہ) برکت والاہے وہ خدا جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا تاکہ وہ تمام دنیا کے انسانوں کے لئے ڈرانے والا ہو جائے۔

اس آیت کریمہ سے یہی ثابت ہوتاہے کہ اسلام کی دعوت صرف عرب کیلئے مخصوص نہیں پھر شرح بخاری میں ہمیں نبی کریم کی یہ حدیث بھی ملتی ہے۔

بعثت الی الناس عامۃ

یعنی میں سب انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

پھر صحابہ کرام کے عمل سے بھی عوام کے اس حق کی تائید ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اہل عجم کے لئے حضرت سلمان فارسی سورہ فاتحہ کا فارسی میں ترجمہ کرتے ہیں۔ اس پر قیاس کرکے امام ابوحنیفہ نے اس شخص کے لئے جو عربی سے بے بہرہ ہو فارسی اور ہر زبان میں نماز جائز قرار دی ہے۔ اگرچہ فضیلت عربی کو ہی حاصل ہے۔

شاہ صاحب نے بھی اس اجتہاد سے کام لے کر عوام کی گردنوں سے نام نہاد پیروں اور مولویوں کا جوا اتارا۔ اور ان کو اس کا موقع فراہم کیا کہ وہ براہِ راست قرآن و حدیث سے اپنا رشتہ جوڑیں۔ فرمایا جو شخص محض امی اور ان پڑھ ہے اس کے لئے تقلید جائز ہے اور جو شخص پڑھا لکھا ہے وہ اگر کسی خاص شخص کی تقلید نہ کرے تو کوئی گناہ نہیں[1]

---

[1] حیات ولی ص——

مولانا محمد عبداللہ عمرپوری لکھتے ہیں۔ سرزمین پاک و ہند میں شاہ صاحب پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ اور اپنے مجوزہ نصاب تعلیم میں قرآن مجید کا ترجمہ لازمی قرار دیا۔ دراصل ان کے پیش نظر یہ تھا کہ تعلیم کے ابتدائی مرحلے ہی میں طالب علم کا قرآن کریم سے براہ راست تعلق ہو جائے۔ اور وہ ہر شعبۂ علم میں۔ روایت میں بھی اور درایت میں بھی قرآن ہی کو اپنی بنیاد بنائے۔ اور ہر مسئلہ میں سب سے پہلے اسی کی طرف مبذول ہو اور اس سے حل ڈھونڈے۔[1]

شاہ صاحب کے اس اقدام کو کیا اہمیت تھی مولانا مناظر احسن گیلانی سے سنئے فرماتے ہیں

> سچ پوچھئے تو اغلاط اور ناقدری کے اس زمانے میں ہمارے مولویوں کے لئے بھی قرآن و حدیث کے یہ تراجم آج اکسیر کا کام دے رہے ہیں عربی مدارس میں ٹوٹی پھوٹی ہمتوں والے طلبا آج جو کچھ پڑھتے ہیں یہ واقعہ ہے کہ ان میں بہت کم ایسے پیدا ہوتے ہیں جو بغیر ترجمہ کی مدد کے قرآن یا حدیث کا پورا مطلب خود سمجھ سکتے ہوں اور سچی بات یہ ہے کہ زبان سے ناواقف ہونیکی وجہ سے اللہ کے بندے اپنے مالک کے براہ راست مخاطب بننے کی سعادت سے محروم تھے۔ درحقیقت جو منافع ان تراجم کے پڑھنے سے پڑھنے والوں کو حاصل ہو سکتے ہیں اور ہو رہے ہیں وہ مولوی کی زبان سے سن کر کبھی حاصل نہیں ہو سکتے تھے بلکہ ترجمہ پڑھنے والے عوام میں کتنے ایسے ہیں جنہوں نے انہیں ترجموں کی مزاولت سے آہستہ آہستہ عربی زبان سے ایسا لگاؤ پیدا کر لیا کہ براہ راست خود کلام اللہ انکی سمجھ میں آرہا ہے خلاصہ یہ کہ شاہ صاحبؒ کے کارناموں میں ترجمہ کی خدمت کو سب سے بڑی خدمت قرار دیتا ہوں[2]

---

[1] الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ص ۳۲۹

[2] تذکرہ شاہ ولی اللہ ص ۲۵۴ - ۲۵۸

اور مولانا عبدالماجد دریا بادی فرماتے ہیں۔

ہندوستان میں قرآن فہمی کا یہ چرچا آج جو کچھ نظر آرہا ہے اور یہ اردو۔ انگریزی اور دوسری زبانوں میں جو بیسیوں ترجمہ شائع ہو رہے ہیں یا ہو چکے ہیں یا آئندہ ہوں گے ان سب کے اجر کا جزو اعظم یقیناً شاہ صاحب کے حسنات میں لکھا جائے گا۔ یہ سارے چراغ اسی چراغ سے روشن ہوئے۔ اگر اس کی ابتدا آپ اپنے مبارک ہاتھوں سے نہ کر جاتے تو نہ شاہ رفیع الدین کا اردو ترجمہ وجود میں آتا نہ شاہ عبدالقادر کا اور متاخرین کا تو ذکر ہی کیا۔ جو شخص امت کی بے شمار نسلوں کے لئے اتنی بڑی رحمت کا دروازہ کھول گیا اس کے اجر بے حساب کا حساب اور مرتبہ بے نہایت کا اندازہ کون کر سکتا ہے[1]

اور مولوی عبدالرحیم۔ حیات ولی میں دعوے سے فرماتے ہیں ــــــــ

اگر آپ کا وجود نہ ہوتا تو ہندو پاک میں جو علمی دنیا میں اسوقت چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں ہرگز نظر نہ آتیں بلکہ خاص خاص محدود حلقوں میں دیکھی جاتیں[2]

شاہ صاحب کے زمانے کے فوراً بعد کیونکہ فارسی کی جگہ اردو نے لینا شروع کر دی تھی۔ اس لئے عظیم باپ کے تربیت یافتہ عظیم بیٹے نے وقت کے تیور پہچان کر قرآن کریم کا اردو ترجمہ کیا۔ اور اس طرح شاہ صاحب کے عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ یہ بات کہ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کو ترجمہ کرنیکا خیال اپنے والد کے ترجمہ ہی کی بنیاد پر ہوا۔ موضح القرآن میں اسکے متعلق شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں۔

بندے عاجز عبدالقادر کو خیال آیا کہ جس طرح ہمارے بابا صاحب حضرت بڑے شیخ ولی اللہ عبدالرحیم کے بیٹے۔ سب حدیثیں جاننے والے

---

[1] الفرقان ولی اللہ نمبر ص ۱۳

[2] حیات ولی ص ۶۳۹

ہندوستان کے رہنے والے نے فارسی میں قرآن کے معنی آسان کر کے لکھے

اس طرح اس عاجز نے ہندی زبان میں قرآن شریف کے معنی لکھے[1]

شاہ عبدالقادر کے اس ترجمے کے متعلق رحیم بخش صاحب فرماتے ہیں۔

قرآن مجید کا سلیس اور ٹھیٹ اردو میں ترجمہ جس خوش اسلوبی اور انوکھے پیرائے میں آپ نے کیا ہے اظہر من الشمس ہے۔ دیکھنے میں نہایت سہل اور مختصر لیکن دقیق اور باریک مطالب سے لبریز۔ قرآن مجید کے ادنیٰ اور غامض مسئلوں کو ایسے سہل طریقے سے بیان کرنا کہ عالم و جاہل یکساں متمتع ہو سکیں تائید غیبی نہیں تو اور کیا ہے۔"[2]

عوامی زبان میں کلام پاک کے ترجمہ کا پہلا اثر یہ پڑا کہ عوام نمازوں اور تلاوت میں جو الفاظ ادا کرتے تھے ان کے مفہوم سے آشنا ہوئے لاعلمی کے باعث سر آستانوں پر سر جھکانے والوں نے جب دن میں پانچ مرتبہ دہرائی جانے والی آیۃ کریمہ ایاک نعبد و ایاک نستعین کے معنی پڑھے تو ایک لمحہ کے لئے سوچ میں ضرور پڑ گئے۔ قول و عمل کا تضاد ابھر کر سامنے آیا اور بہت سی سعید روحیں جو محض لاعلمی کی بناء پر اس تضاد کا شکار ہو رہی تھیں خود تائب ہو کر دوسروں کی اصلاح میں مصروف ہوئیں۔ آیۃ نحن اقرب علیہ من حبل الورید۔ اور ادعونی استجب لکم۔ جیسے لطیف اور دل گرمانے والے جملوں نے خدا اور بندے کے رشتہ کو استوار کیا۔ شاہ صاحب کے ذریعہ خدا کی نعمت عوام کے لئے عام ہو گی۔

شاہ صاحب اور شاہ رفیع الدین کا عمل بارش کے پہلے قطرے جیسا تھا۔ پھر تو باران رحمت موسلا دھار برسا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف جل تھل کا سا عالم ہو گیا۔ اس وقت دنیا کی تقریباً ہر زبان میں کلام پاک کا ترجمہ موجود ہے۔ اور اس وقت ہند و پاک میں جہاں سے جہاں تک سچے اسلام کی روشنی نظر آتی ہے اور شرک و بدعت سے صاف اور نتھرا ہوا مذہب دکھائی دیتا ہے سب اسی ترجمہ کا صدقہ ہے۔[3]

---

[1] حیات ولی ص ۱۶ا [2] موضح القرآن [3] حیات ولی ص ۶۳۹

کچھ تفسیر کے بارے میں۔

تفسیر ترجمے کا ایک لازمی جزو ہے اور شاہ صاحب کے زمانے میں تفسیر کا معاملہ ترجمے سے بھی زیادہ اہم تھا۔ علماء کرام نے ایک ایک آیۃ کریمہ کی تفسیر و تشریح میں ایسی ایسی علمی موشگافیاں کی تھیں اور ان کو اس قدر طول دیا تھا۔ مخصوص صلاحیت رکھنے والے افراد کے علاوہ عام لوگوں کے لئے ان کا پڑھنا اور سمجھنا گویا جوئے شیر لانا تھا۔ تفسیر میں طوالت سے قطع نظر اسرائیلی روایات کی بھرمار نے قرآن کریم کے بعض حکیمانہ کفایت کو قصہ کہانی کی شکل دیدی تھی۔ اور ہر آیت کے ساتھ شان نزول کے التزام نے عمومی اور مطلق احکامات کو مخصوص اور مقید کر دیا تھا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

عام مفسرین بر آیت را از آیاتِ مخاصمہ و آیاتِ احکام قصہ مربوط سازند و آں قصہ را سبب نزول انگارند و ایں را چنداں دخل نیست[1]

مفسرین کی اس روش کا عوام پر جو اثر پڑا وہ مولانا عبید اللہ سندھی کے الفاظ میں سنئے فرماتے ہیں۔

در حقیقت قرآن کریم کو آیات احکام تک محدود کرنے اور ان آیات کو عمومی مطالب کے بجائے جزوی واقعات کے ساتھ مخصوص کرنے کا یہ اثر ہوا کہ قرآن بہ حیثیت مجموعی زندگی میں موثر نہیں ہوا۔[2]

شاہ صاحب نے ان قباحتوں کو سمجھا اور الفوز الکبیر لکھ کر ایک بہت دشوار مسئلے کو آسان تر بنا دیا۔ آپ نے قرآن کریم میں بیان شدہ تمام عوارف و معارف کو پانچ اقسام کے علوم میں تقسیم کر کے فن تفسیر نویسی میں ایک جدید باب وا کیا۔

انہوں نے فن تفسیر کو اسرائیلیات سے پاک کیا شان نزول کو عمومیت بخشی اور بڑی جراءت اور حق گوئی کے ساتھ واضح کر دیا کہ منافقین مشرکین اور گنہگار صرف اس زمانے میں نہیں تھے بلکہ ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

(۱) الفوز الکبیر ص ۳ ۔ (۲) شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص ۳۷

"صحابہ اور تابعین کے کلام کے استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ نزلت فی کذا۔ محض اس واقعہ کے لئے نہیں ہے جو عہد نبوی میں ہوا اور نزولِ آیت کا سبب بن گیا۔ بلکہ اس پر بھی بولتے ہیں جس پر یہ آیت صادق آرہی ہو۔ خواہ وہ واقعہ عہد نبوی میں ہو یا بعد کو" [1]

مثلاً سورہ مدثر کی گیارہویں سے پچیسویں آیت تک قرآن کریم میں سرمایہ پرستوں کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔ جسے علماء کرام نے شان نزول میں حضورؐ کے زمانے کے ایک سرمایہ دار ولید بن مغیرہ سے خاص کر دیا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

چاہیئے کہ ان آیات کو ہر زمانے پر چسپاں کر کے دیکھا جائے اور ہر شخص اپنی ذہنیت کا جائزہ لے کر فیصلہ کرے کہ وہ کہاں تک اس سرمایہ پرستی کی ذہنیت میں مبتلا ہے۔ [2]

یوں انہوں نے عامۃ الناس کو اپنے اعمال و افکار کے تجزیئے کا ایک موقع فراہم کیا۔ مولوی رحیم بخش الفوز الکبیر کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

سخت حیرت ہوتی ہے کہ اصول تفسیر کے عمیق اور گہرے دریا کو اس مختصر کوزے میں کس طرح بند کیا گیا ہے۔ اصول تفسیر کے وہ اہم اور پیچیدہ مباحث جو بڑی بڑی کتابوں میں بمشکل حل ہو سکتے تھے شاہ صاحب نے اس مختصر اور سہل عبارت میں طے کر دیئے ہیں جس سے کم استعداد طالب بھی خاطر خواہ متمتع ہو سکتے ہیں۔ اور معتد بہ فائدہ

---

[1] الفوز الکبیر ص ۳

[2] شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص ۳۷ - ۳۸

[3] الفوز الکبیر سبب نزول

[4] شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص ۲۸

[5] حیات ولی ص ۵۲۵ - ۵۲۹

اٹھا سکتے ہیں اس مختصر رسالے نے بڑی بڑی تفاسیر کے دیکھنے اور
اور برسوں کے مطالعہ سے شائقین کو مستغنی کر دیا۔ اور مولانا
سندھی کا سر شوریدہ بھی الفوز الکبیر کے ذریعہ ہی بایں آسائش
تک پہنچا۔ فرماتے ہیں جب سندھ پہنچا تو مجھے الفوز الکبیر کا نسخہ ملا۔
اس سے پیشتر میں امام رازی کی تفسیر کا مطالعہ کر کے کافی پریشان
ہو چکا تھا۔ فوز کبیر کی فصل اول کا مطالعہ کرنے کے بعد میں مطمئن
ہو گیا کہ انشاء اللہ علم تفسیر سمجھ میں آ سکتی ہے۔ پھر اس دن سے
اب تک میں ان کے۔ یعنی شاہ صاحب کے مسلک سے باہر جانیکی
ضرورت محسوس نہیں کر سکا۔[1]

اور سید ابوالحسن ندوی فرماتے ہیں۔

اس کی الفوز الکبیر کی۔ قدر وہی لوگ جان سکتے ہیں جن کو تفسیری مشکلات
سے واسطہ پڑا ہو۔ بعض اصول جو انہوں نے شاہ صاحب نے اپنے
ذوق وجدان اور فہم قرآن کی بناء پر لکھدیئے ہیں دوسری کتابوں کے
سیکڑوں صفحات کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہو سکتے۔[2]

اس کی اس اہمیت کا اندازہ خود شاہ صاحب کو بھی تھا فوز کبیر کے مقدمہ میں فرماتے ہیں۔

میگوید فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم چوں برایں فقیر درے از
فہم کتاب اللہ کشادند خواست کہ بعضے نکات نافعہ کہ در تدبر
کلام اللہ یاراں را بکار آید در رسالہ مختصرے مضبوط نماید امیدوار
از عنایت حضرت ربی آنست کہ طالب علماں را بہ مجرد فہم ایں
قواعد راہے واسع در فہم معانی کتاب اللہ کشادہ گردد کہ اگر عمرے

---

[1] الفرقان ص ۲۲۸

[2] الفرقان ص ۳۴۱

در مطالعہ تفاسیر سے گزرانیدن آنہا بہ مفسران علی انھم اقل
قلیل فی ہذالزماں بسر برندبآں ضبط وربط بدست نیارند۔
غرض قرآن مجید کے جملہ مطالب کا اجمالی تعارف کرانے کے لیے
شاہ صاحب نے الفوزالکبیر لکھی اور فتح الخبیر تصنیف فرماکر
تفسیر بالرائے کے بجائے تفسیر بالروایت کی طرف متوجہ کیا۔[1]

خلاصہ یہ کہ شاہ صاحب اور ان کے والد کو زمانے میں فقہا اور مفسرین نے عوام مسلمانوں کی روزمرہ زندگی سے قرآنی تعلیمات کو بحیثیت مجموعی خارج کر دیا تھا لہذا ضرورت تھی کہ قرآن مجید کو عامۃ المسلمین کے ذہنوں کے قریب لایا جاتا تاکہ انکی تربیت قرآن کے اصولوں پر ہوسکتی آپ کے زمانے میں مسلمانوں کے ذہنوں کے قریب لایا جاتا تاکہ ان کی تربیت قرآن کے اصولوں پر ہوسکتی۔ آپ کے زمانے میں مسلمانوں کی رسمی زبان فارسی تھی۔ آپ نے قرآن کو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے قابل فہم بنانے کی خاطر اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اور اس پر تشریحی فوائد لکھے۔

قرآن مجید ہی کے سلسلہ میں شاہ صاحب کا ایک بہت بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس سوسائٹی کو جس کے لیے بلاغت کے ذریعہ قرآن کا سمجھنا اور سمجھانا ممکن نہیں رہا تھا۔ بتایا کہ قرآن کا معجزہ ہونا فصاحت و بلاغت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ جو نظام حیات وہ پیش کرتا ہے وہ اس کا اعجاز ہے گویا شاہ صاحب نے قرآن مجید کی علمی افادیت کو اس کا معجزہ ہونا ثابت کیا جب کہ اب قرآن کے اس نظام حیات سے ہر شخص خواہ وہ عربی یا عجمی۔ عامی ہو یا عالم۔ فلسفی ہو یا سادہ مزاج مستفید ہو سکتا اور اس کے اعجاز کو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اگر قرآن کا اعجاز محض عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کا پابند ہو جاتا تو اس صورت میں معدودے چند افراد کے علاوہ دوسرے لوگ اسکی اعجازی خوبیوں سے محروم رہتے۔ اور انہوں نے قرآن عظیم کے مطالب کو اس شکل میں پیش

---

[1] مولانا محمد عبداللہ عمر پوری الرحیم ستمبر ۶۳ء صـ ۹۴

کرنے پر صرف اکتفا ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے صحبت یافتہ لوگوں میں سے اس طریقے پر سوچنے والی ایک جماعت بھی پیدا کر دی [1]

الفوز الکبیر میں جامع اور مختصر تفسیر تھی۔ اس کے بعد اس کی روشنی میں اور انہیں خطوط پر چلکر شاہ رفیع الدین شاہ عبدالقادر مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا .... اور شبیر احمد عثمانی نے اردو میں عام فہم اور مختصر تفاسیر لکھیں۔ جن کی بدولت آج ایک معمولی نوشت وخواند کی صلاحیت رکھنے والا انسان بھی شریعت الٰہی کو سمجھ سکتا ہے اور اس کی روشنی میں ایک بہتر زندگی کا لائحہ عمل مرتب کر سکتا ہے۔

شاہ صاحب حقیقی معنوں میں حکیم الامت تھے۔ انہوں نے مسلم معاشرے کی ذہنی اصلاح یکسر ایسا مواد مہیا کیا جس سے نہ صرف علوم اسلامیہ کا احیاء ہوا بلکہ مسلم معاشرے میں اصلاح کی تحریک شروع ہوئی اور لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ انہوں نے جمود کو توڑا عمل کی دعوت دی قرآن و حدیث کو عام کیا فقہ کی حیثیت معین کی۔ عقائد کو واضح کیا اور مسلمانوں کو عمل کی دعوت دی۔

بقول مولانا سعید احمد اکبرآبادی۔

آج ہندوستان میں علم دین کا چرچا۔ مذہبی بیداری اور شرک و بدعت سے اجتناب اور علماء کا وقار جو کچھ نظر آتا ہے یہ سب شاہ صاحب کے فنی مجددانہ کارناموں کا اثر مابعد ہے [2]

اور یہ واقعہ ہے کہ اگر شاہ صاحب قرآن و حدیث کے تراجم کی بنیاد ڈال کر نہ چلے جاتے تو اس وقت بھی قرآن عربی زبان میں ہونے کی وجہ عوام کی دسترس سے باہر ہوتا ان کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے ہندوستان میں قرآن و حدیث کے ترجمے کی بنیاد ڈالی۔

---

[1] عبیداللہ سندھی۔ شاہ ولی اللہ ایک اجمالی تعارف الرحیم جون ۱۹۶۳ء ص ۹-۱۷

[2] الفرقان ولی اللہ نمبر ص ۳۲۹